ڈاکٹر محمد سلیم احمد

# قادیانی اور برصغیر کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی

برصغیر ہندو پاکستان ایک سے زیادہ مذاہب کے ماننے والوں کی سرزمین ہے۔ لیکن اس میں دو بڑے مذاہب کے پیروکاروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اولاً ہندو پھر مسلمان اس کے بعد بدھ، عیسائی، سکھ اور دوسرے مذاہب آتے ہیں۔ ہندو مذہب اس سرزمین کا سب سے قدیم مذہب ہے۔ اسلام کے ماننے والوں نے جنہیں مسلمان کہا جاتا ہے، اس سرزمین میں تقریباً ساتویں صدی عیسوی میں قدم رکھا، ابتداء میں ان کی تعداد مختصر تھی، لیکن پھر یہیں کے رہنے والے ہندوؤں، بدھوں اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں نے اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اس مذہب کو بخوشی و رغبت قبول کرنا شروع کر دیا، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی تعداد اتنی تیزی سے بڑھی کہ اسلام برصغیر کا دوسرا بڑا مذہب ہو گیا۔

باوجودیکہ اسلام نے برصغیر ہندو پاکستان میں تیزی سے ترقی و مقبولیت کے منازل طے کیے، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کی ترقی کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں بھی حائل ہوتی رہیں، جس کے باعث اسلامی سوسائٹی تقسیم اور شکست و ریخت کا شکار بھی ہوتی رہی۔ اور آج بھی ہے، مسلمانوں کی اس اندرونی کمزوری کی وجہ سے کسی حد تک مقامی ہندو مذہب کے پیروکاروں نے فائدہ اٹھایا جس میں ان کی مسلمانوں کے خلاف مزاحمت شامل ہے۔ لیکن بڑی وجہ خود مسلمانوں کے اندر تقسیم کا عمل تھا، جو عقائد کی بنیاد پر وجود میں آیا، اس وجہ سے اسلامی اتحاد کو اکثر و بیشتر برے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

اسلام کے ابتدائی دور ہی سے برصغیر کی اسلامی سوسائٹی شیعہ اور سنی عقائد کی بنیاد پر بٹی رہی، یہ تقسیم آج بھی جاری ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کی متحدہ قوت ہمیشہ سے کمزوری کا شکار رہے۔ دوسری کمزوری پندرہویں صدی میں سید محمد جونپوری (۱۴۴۳ - ۱۵۰۴) کی مہدوی تحریک ہے جس نے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں ایک اور فرقے کی بنیاد ڈالی۔ آج مہدوی تحریک کے پیروکار جنوبی ہند میں بہت جگہ پائے جاتے ہیں، برصغیر کے دوسرے علاقے بھی ان سے خالی نہیں، لیکن برصغیر کے جس علاقے میں مہدوی تحریک کے پیروکار ایک منظم گروہ کی شکل اور بڑی تعداد میں موجود ہیں، وہ پاکستان کا صوبہ بلوچستان ہے جہاں وہ "ذکری" فرقے کی شکل میں موجود ہیں۔

انیسویں صدی میں برصغیر پر انگریز حکمرانی کے دوران مسلمانوں میں عقائد کو بنیاد بنا کر ایک اور فرقے کی

ابتداء ہوئی جس نے مسلمانوں کی وحدت کو اور کمزور کر دیا۔ اس نئے فرقے کے بانی مرزا غلام احمد (۱۹۰۸ - ۱۸۳۹) تھے، جو پنجاب کے ایک ضلع گورداسپور کے قصبہ قادیان میں پیدا ہوئے۔ چونکہ وہیں سے انہوں نے اپنی تحریک کی ابتداء کی، اس لیے ان کے عقائد کو ماننے والے قادیانی کے نام سے مشہور ہوئے۔ مرزا غلام احمد نے جو عقیدہ دیا اس کے مطابق وہ خود ہادی رسول اور اللہ کے آخری پیغمبر ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ قادیانیوں کے عقائد کیا ہیں، یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ اسلامی عقائد میں تحریف یا قطع و برید کر کے جو گروہ وجود میں آئے ان کی وجہ سے اسلامی اتحاد کو برصغیر میں ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ قادیانیوں نے مسلمانان برصغیر کی جدوجہد میں کیا کردار ادا کیا؟ اس مختصر مضمون میں اس پر کچھ روشنی ڈالی گئی ہے لیکن یہاں صرف ایک دو حوالوں سے ہی گفتگو ہو سکے گی۔

مرزا غلام احمد کا خاندان ایران سے نقل مکانی کر کے پنجاب کے ضلع گورداسپور میں آکر آباد ہوا تھا۔ یہ خاندان مغلوں کے برلاس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس خاندان کی آمد برصغیر کے پہلے مغل فرمانروا (۱۵۳۰ - ۱۵۲۶) ظہیر الدین بابر کے دور میں ہوئی۔ جلد ہی یہ خاندان گورداسپور میں جہاں ان کے آباء نے پڑاؤ ڈالا جاگیر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا، اور اپنی جڑیں مضبوط کر لیں۔

مرزا غلام احمد نے ابتداء میں سرکاری نوکری کی۔ لیکن شروع ہی سے یہ مذہب کی طرف کچھ زیادہ ہی راغب تھے، جس کے نتیجہ میں اسلام کی تبلیغ کے کام میں غیر معمولی دلچسپی لیتے رہے، انہوں نے اپنے تبلیغی کام کا آغاز قرب و جوار کے نچلے طبقوں جو بھنگیوں اور کوڑا کرکٹ اٹھانے والوں پر مشتمل تھا کی بستیوں میں جا کر کیا لیکن انیسویں صدی کے اختتام سے قبل ہی مرزا غلام احمد نے نبی اور مبلغ ہونے کا اعلان کر دیا۔ انہی خیالات کو بنیاد بنا کر قادیانی مذہب کی تبلیغ کو اپنا مطمح زندگی بنا لیا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی سال ۱۹۰۱ء میں اس وقت کی مردم شماری کے مطابق پنجاب میں مرزا کے پیروکاروں کی تعداد ۱۱۱۳ تک جا پہنچی تھی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ برصغیر کے دیگر علاقوں میں بھی اس وقت قادیانی تھے یا نہیں لیکن یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ معمولی تعداد میں ان کے پیروکار برصغیر کی دوسری جگہوں پر بھی ضرور پیدا ہو گئے ہوں گے۔

مرزا غلام احمد کے مذہبی خیالات سے انگریزوں کو کوئی تعرض نہ ہوا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی تحریک اور خیالات کو انگریزوں نے اپنے لیے مفید پایا۔ کیونکہ ان کی تعلیمات میں یہ عنصر شامل تھا کہ حاکم وقت کے خلاف مسلمانوں کو کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیئے، بلکہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ انگریزوں کی مدد کریں۔ انہی عقائد کو بنیاد بنا کر مرزا غلام احمد نے یہ بھی اعلان کیا کہ مسلمانوں کے لیے اب جہاد فرض نہیں رہا۔ بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں کو اس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ یقینی طور پر یہی وجہ رہی ہوگی کہ انگریز حاکموں نے نہ صرف مرزا غلام احمد کی سرگرمیوں پر کوئی پابندی نہیں لگائی، بلکہ اسے اپنے لیے مفید سمجھ کر ہمت افزائی بھی کی۔

۱۹۰۷ء کی خفیہ محکمہ کی ایک رپورٹ میں جو سکریٹری حکومت ہند کو بھیجی گئی تھی، مرزا غلام احمد کی تحریک وعقائد کے حوالے سے ان خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ۔ ان کے عقائد سے صرف برطانوی حکومت کے لیے وفاداری کی جھلک ہے ۔ اس کے ساتھ ہی اس رپورٹ میں اس بات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے کہ مرزا غلام احمد کے عقائد کی بناء پر ان کے بیٹے سلطان احمد کو جو پنجاب میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدہ پر تعینات ہیں اپنے باپ سے کوئی ہمدردی نہیں ہے اور نہ ہی ان کا اپنے باپ سے کوئی رابطہ ہے ۔

مرزا کی ذاتی شخصیت کے بارے میں بھی اس خفیہ رپورٹ میں تحریر کیا گیا ہے جس کے مطابق مرزا غلام احمد "عورتوں کا رسیا ہے اور خاص طور سے وہ اپنے پیروکاروں کی خواتین کے درمیان اپنا زیادہ وقت گزارتے ہیں ۔" سیکرٹری حکومت ہند نے ان معلومات کی روشنی میں اپنا یہ خیال ظاہر کیا، مرزا غلام احمد ایک "دھوکے باز" شخص ہے ۔

حکومت برطانیہ کے نزدیک مرزا غلام احمد اور ان کی تحریک کی خواہ کچھ ہی اہمیت کیوں نہ رہی ہو مسلمانانِ برصغیر نے قادیانی تحریک کو اسلامی اتحاد میں ایک اور دراڑ کی نظر سے دیکھا جیسے جانا تھا ۔ اس لحاظ وہ لوگ جو اسے اسلام کے لیے خطرہ سمجھتے تھے انہوں نے اس کے سدباب کے لیے کوششیں شروع کر لیکن ان کی کامیابی محدود ہی رہی ۔ دوسری طرف قادیانیوں نے اپنی حیثیت مستحکم کرنے کے لیے تگ ودو شروع کر دی جس میں وہ مسلسل کامیابی حاصل کرتے رہے اور کر رہے ہیں ۔

بیسویں صدی کا اول نصف برصغیر ہند و پاکستان میں ہندو اور مسلمانوں کی سیاسی تحریکوں کی تاریخ ہے ۔ ان میں ایک عنصر مشترک تھا ۔ دونوں انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے ۔ لیکن مسلم سیاسی تحریک کا ایک اور مقصد بھی تھا ۔ وہ تھا انگریزوں کے علاوہ ہندوؤں کی بالادستی سے بھی چھٹکا حاصل کرنا ۔ قادیانی رہنماؤں نے مسلمان تحریک آزادی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، مقصد اس کا کے سوا کچھ اور نہیں معلوم ہوتا کہ قادیانیوں کی اہمیت کو تسلیم کروایا جائے ۔ اس اسکیم پر پہلا باقاعدہ عمل وقت ہوا جب برصغیر کے مسلمان خلافت کے مسئلہ پر الجھے ۔

جنگ عظیم اول (۱۹۱۸ - ۱۹۱۴) جس میں ترکی جرمنی کا حلیف تھا ۔ نے ترکوں کی سلطنت عثمانیہ پر دوررس اثرات ڈالے ۔ ایک بڑا حادثہ یہ ہوا کہ جنگ کے خاتمے پر نہ صرف ترکی کے زیر اثر علاقے اس سے چھین لیے گئے بلکہ ترکی کے سلطان کو جس کی حیثیت خلیفۃ المسلمین کی بھی تھی کچھ وقت سے ۔ اس کے علاوہ ترکوں کا اپنا علاقہ اناطولیہ ہی یورپی طاقتوں کی سیاست کا مرکز بن گیا ۔ مقصد ترکوں کو ایک بہت ہی مختصر علاقے تک محدود کرنا تھا ۔ اس بات کا فیصلہ جنگ عظیم کے ختم ہونے کے

فرانس کے دارالحکومت پیرس میں متفتوح یورپی اقوام کو کرنا تھا۔

برصغیر کے مسلمانوں نے ترکی کے ساتھ اس زیادتی کے خلاف آواز اٹھائی، گو اس وقت ان کی سیاسی جماعت کل ہند مسلم لیگ موجود تھی، جسے قائم ہوئے بارہ سال گزر چکے تھے لیکن مسلم لیگ سیاسی جماعت تھی نہ کہ مذہبی، لہٰذا اس کے رہنماؤں کا یہ خیال بجا طور پر صحیح تھا کہ ترکوں اور خلافت کا معاملہ مذہبی معاملہ ہے اور اسے مسلمانوں کی مذہبی جماعت کے ذریعہ حل کروانا بہتر ہوگا۔ مزید یہ کہ مسلم لیگ مسلمانان برصغیر کے مذہبی ثقافتی و سیاسی حقوق پر تو آواز اٹھا سکتی تھی لیکن برصغیر کے باہر کے مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا اس کے منشور میں کوئی ذکر نہ تھا۔ تاہم مسلم لیگ کے ہر مبصر کو ترکی اور خلافت سے جذباتی لگاؤ تھا۔ اس لیے طے یہ کیا گیا کہ ایک علیحدہ کانفرنس کرکے اس مسئلہ پر متحدہ آواز اٹھائی جائے۔

مسلم لیگ کے سیکرٹری سید ظہور احمد نے بڑی تگ و دو کی اور ایک کل ہند مسلم کانفرنس کے انعقاد کا انتظام کیا۔ یہ کانفرنس لکھنؤ میں ۲۱ ستمبر ۱۹۱۹ء کو خاص خلافت کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے بلائی گئی۔ کانفرنس میں ملک کے طول و عرض سے علماء اور غیر علماء مسلمان رہنما شامل ہوئے۔ اہم بات اس کانفرنس کے حوالے سے قادیانیوں کی شرکت اور مسلمانوں کے ردعمل کی ہے۔

جماعت احمدیہ قادیان نے بھی اس کانفرنس میں شرکت کی غرض سے ایک وفد بھیجا جو مولوی شیر علی ناظر اعلیٰ جماعت احمدیہ، مولوی سرور شاہ، ناظر تعلیم احمدیہ مدرسہ لاہور، ماسٹر محمد دین، ہیڈ ماسٹر تعلیم السلام مدرسہ قادیان یعقوب علی تراب احمدی ایڈیٹر الحکیم اور چودھری محمد ظفر اللہ خان (م ۱۹۸۴ - ۱۸۹۳) صدر جماعت احمدیہ لاہور پر مشتمل تھا۔

بشیر الدین محمود (م ۱۹۶۵ - ۱۸۸۹) نے جو مرزا غلام احمد کے جانشین تھے ایک طبع شدہ پیغام اپنے وفد کے ہمراہ اس غرض سے بھیجا کہ کانفرنس میں پڑھ کر سنایا جائے۔ لیکن کانفرنس کے منتظمین نے احمدیہ جماعت کے وفد کو نہ صرف کانفرنس میں شریک کرنے بلکہ تقریر کرنے کے لیے وقت دینے سے بھی انکار کر دیا۔ احمدیہ قائدین جو پیغام کانفرنس کے ذریعہ پہنچانا چاہتے تھے وہ ان خیالات پر مبنی تھا کہ مسلمانان برصغیر کو سلطان ترکی اور اس کے خلیفہ ہونے کے حوالے سے کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ سلطان کو خلیفہ نہ ماننے والے احمدی ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ شیعہ اور اہل حدیث بھی شامل ہیں۔ نیز یہ کہ مسلمانوں کو کسی قسم کی تحریک خلیفہ کی حمایت میں نہیں کرنی چاہیے، اگر انہوں نے ایسا کیا تو وہ نہ صرف حکومت برطانیہ کے مجرم ہوں گے بلکہ اس کے ناشکر گزاروں میں سمجھے جائیں گے۔

اپنے مقاصد میں ناکامی پر قادیانی وفد نے لکھنؤ میں پریس کانفرنس کرکے اپنے خیالات اور حکمت عملی

کو مسلمانوں تک پہونچانے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ کیونکہ کسی اخبار نے ان کے خیالات کو شائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس بات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ قادیانی اپنے عقائد اور حکمت عملی دونوں کو مسلمانوں میں مقبول بنانے میں ناکامیاب رہے۔ نیز یہ کہ من حیث القوم مسلمانوں نے قادیانیوں کو اپنا حصہ ماننے سے انکار کر دیا۔

قادیانیوں کو مسلم لیگ کی سطح پر اس وقت کسی حد تک کامیابی حاصل ہوئی جب ۱۹۳۱ء میں ظفر اللہ خان کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کا صدر چنا گیا۔ یہ اجلاس جس افراتفری کا شکار رہا اس کا ذکر یہاں کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ جس جگہ اجلاس ہونا طے پایا تھا وہاں اجلاس نہ ہو سکا، کیونکہ لوگ ظفر اللہ خان کو صدر ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ دو تین جگہ اجلاس کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ بالآخر یہ اجلاس ایک قادیانی نواب علی خان صاحب کے مکان پر کیا جا سکا۔ نواب علی، قادیانی رہنما بشیر الدین محمود کے رشتہ داروں میں سے تھے۔ یہ بتانا غیر ضروری نہ ہوگا کہ اس اجلاس کے انعقاد کے لیے بشیر الدین محمود نے مسلم لیگ کی خراب مالی حالت کے پیش نظر کچھ رقم بھی بطور عطیہ دی تھی۔ مسلم لیگ کا یہ واحد اجلاس تھا جس میں صدارتی خطبے کے بغیر کام چلایا گیا۔ ابتداً اجلاس کی صدارت کے لیے محمد علی جناح (۱۹۴۸ - ۱۸۷۶) اور پھر آغا خان (۱۹۵۷ - ۱۸۷۷) کو دعوت دی گئی تھی۔ لیکن ۲۷ نومبر ۱۹۳۱ء کو آغا خان نے تار کے ذریعہ مسلم لیگ کے سیکرٹری محمد یعقوب (۱۹۴۲ - ۱۸۷۹) کو اطلاع دی کہ "ان کا اور جناح کا آنا ناممکن ہے" اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ لندن میں ہندوستان کے مسائل کے حل کے سلسلے میں گول میز کانفرنس کا سلسلہ جاری تھا۔ اس وجہ سے برصغیر کے مسلمان رہنماؤں کی ایک بڑی تعداد وہاں گئی ہوئی تھی۔ کسی مقتدر شخصیت کی عدم دستیابی کے باعث ظفر اللہ خان کا انتخاب عمل میں آیا۔ لیکن مسلم لیگ کا یہ سالانہ جلسہ کچھ کامیاب ثابت نہ ہوا، کیونکہ کسی کھلی جگہ پر اس اجلاس کو کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ ۱۹۳۳ء میں جب چودھری رحمت علی نے (۱۹۵۱ء - ۱۸۹۷ء) گول میز کانفرنس کے موقعہ پر ہی لندن میں اپنی پاکستان اسکیم "اب یا کبھی نہیں" (NOW OR NEVER) شائع کی تو ظفر اللہ خان جو اس وقت لندن میں تھے اور جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے سامنے برصغیر کی سیاسی حالت پر اپنا نقطہ نظر پیش کر رہے تھے۔ کمیٹی کے چیئرمین نے جب اُن سے پاکستان اسکیم کے بارے میں سوال کیا تو اس کے جواب میں ظفر اللہ خان نے کہا کہ یہ تو طلباء کے ذہن کی اختراع ہے۔ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

۱۹۳۷ء میں برصغیر میں ایک نئے سیاسی دور کا آغاز ہوا۔ اس سال پہلی بار صوبائی سطح پر برصغیر کے

لوگوں کو حکومت کا انتظام ان کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعہ سونپا گیا۔ اس کا بڑا فائدہ ہندوؤں کو پہنچا۔ چنانچہ ملک کے تقریباً سات صوبوں میں ہندوؤں نے اپنی سیاسی جماعت کانگریس کے جھنڈے تلے، حکومتیں تشکیل دیں۔ یہ انتظام دو سال تک جاری رہا۔ لیکن اس دوران مسلمانوں کو بے انتہا مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور انہیں ہندوؤں کی حکومت کے تحت زندگی گزارنے کا تلخ تجربہ بھی ہوا۔

ان حالات کو سامنے رکھ کر مسلم لیگ نے مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے سالانہ جلسے میں برصغیر کی تقسیم یا پاکستان کا مطالبہ کر دیا۔ قادیانیوں کو ان حالات نے بڑی حد تک پریشانی اور شش و پنج میں مبتلا کر دیا۔ انہوں نے تقسیم اور پاکستان کے قیام کو اپنے مفادات کے خلاف سمجھا۔ اس کا اندازہ مسلم لیگ اور قادیانیوں کے درمیان ان مذاکرات سے ہوتا ہے جو مطالبہ پاکستان کے فوراً بعد قادیانی رہنماؤں نے نہ صرف مسلم لیگ اور اس کے قائد محمد علی جناح سے کیے بلکہ مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری سے بھی اپنی جماعت اور اس کی اہمیت کے حوالے سے بات چیت کی۔ لیکن یہ مذاکرات ناکام رہے۔ اس تمام گفت و شنید کی اطلاع مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری نے نواب زادہ لیاقت علی خان (۱۹۵۱ء۔ ۱۸۹۵ء) کو، جو ۱۹۳۶ء سے مسلم لیگ کے سیکرٹری منتخب ہوتے چلے آرہے تھے، اپنے ایک خط مورخہ ۹ اگست ۱۹۴۰ء کو لکھ کر بھیجی۔ یہ تفصیلات تاریخی اعتبار سے دلچسپ تاریخی اور اس وجہ سے بہت اہم ہیں۔

ابتداء میں ناظر قادیان مسٹر جناح سے مصالحت کرنا چاہتے تھے۔ جس چیز کو بنیاد بنا کر انہوں نے اپنی کچھ تجاویز پیش کیں، وہ یہ تھیں کہ ان کی جماعت کے لوگ منظم ہی نہیں باہم متحد بھی ہیں اگر مسلم لیگ نے ان کو مراعات نہ دیں تو وہ کانگریس میں شامل ہو جائیں گے۔ مسٹر جناح نے جواب دیا، "یہ آپ کا اپنا معاملہ ہے جو طریقہ اختیار کرنا چاہیں کریں۔" صاف ظاہر ہے صدر مسلم لیگ نے کسی بھی قسم کی سودے بازی سے انکار کر دیا۔ اس بات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلم لیگ اور اس کے رہنما تجارت کے اصولوں میں سے کسی ایک کو بنیاد بنا کر مسلم لیگ کے لیے حمایت حاصل کرنا غیر ضروری سمجھتے تھے۔ جناح صاحب سے مایوس ہو کر ناظر قادیان نے مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سکرٹری سے گفت و شنید کی بنیاد ڈالی اس کی ابتدا اس خط سے ہوئی جو انہوں نے ۱۹ مئی ۱۹۴۰ء کو لکھا، مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری سے بھی جماعت قادیان مطمئن نہ ہو سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ سیکرٹری کے جوابات نے خود اسے ناظر قادیان کے غیض و غضب کا شکار بنا دیا۔ اس کی تفصیل لکھتے ہوئے انہوں نے اپنے خط حوالہ درج بالا میں لیاقت علی خاں سے

شکایت بھی کی۔ قادیانی رہنماؤں کو مسلم لیگ سے جو شکایت تھی اور جس کا وہ ازالہ چاہتے تھے وہ پنجاب میں قادیانیوں کے خلاف چلنے والی تحریک تھی۔ ناظر قادیان کا کہنا تھا کہ ۳۷۔۱۹۳۶ء کے الیکشن میں پنجاب میں ان کے قادیانی ہونے کے خلاف تحریک چلائی گئی، جس کی وجہ سے ان کی انتخابی مہم پر بُرے اثرات پڑے تھے۔ ان کو خدشہ تھا کہ آئندہ بھی کسی موقعہ پر یہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا مسلم لیگ کو چاہیئے کہ اپنے دستور کے ذریعہ قادیانیوں کو اسلام کے دائرے میں ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دے۔ یہ ایک مشکل ہی نہیں ناممکن تجویز تھی ایسی صورت میں مسلم لیگ اس کو کیسے قبول کر سکتی تھی اور ہوا بھی یہی۔

مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری نے ناظر قادیان کو اس بارے میں جو وضاحت پیش کی جس کا خلاصہ انہوں نے لیاقت علی خان کو لکھ کر بھیجا وہ یہ ہے۔

"اگر ہم لفظ "مسلمان" کی اپنے دستور میں تشریح و تعریف کریں گے تو اس سے معاملات بہت خراب ہی نہیں ہوں گے، بلکہ بغاوت کی شکل اختیار کریں گے۔ یہ غیر تشریح شدہ لفظ ہی تھا، جس کے باعث ظفر اللہ خان مسلم لیگ کی صدارت کے عہدے تک پہونچے اور جو کچھ اعلیٰ حیثیت ان کی اس وقت ہے وہ اسی وجہ سے ہے۔"

اسسٹنٹ سیکرٹری کی یہ بات بھی قابل غور ہے جو انہوں نے لیاقت علی خان کو قادیانیوں کے مسلمان ہونے کے بارے میں لکھی۔ بقول ان کے اگر لفظ "مسلمان" کی تشریح کرنا ضروری ہی سمجھا جائے تو پھر ناظر قادیان سے مجھے (اسسٹنٹ سیکرٹری) یہ پوچھنے کا حق ہے کہ وہ خود دوسرے مسلمانوں کے لیے اپنا نقطۂ نظر واضح کریں جو احمدی یا قادیانی نہیں ہیں، کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ قادیانیوں کے بانی کے فتوے کے مطابق دوسرے تمام مسلمان "کافر" ہیں۔ میں بلا خوف تردید یہ بات کہتا ہوں کہ قادیانیوں کا یہ فتوے ہی ہے جس نے ان کے اور دیگر مسلمانوں کے درمیان وسیع اختلاف کی خلیج حائل کر دی ہے۔ یہ خلیج لفظ "مسلمان" کی تشریح کرنے سے ختم نہیں کی جا سکتی، یہاں یہ بات قابل غور و فکر ہے کہ پاکستان کی حکومت نے قادیانیوں کو کافر قرار دے دیا ہے۔ جس کے باعث اکثر یہ فیصلہ تنقید کا شکار رہتا ہے۔ لیکن تنقید نگاروں نے اس فیصلے کو کبھی قادیانی جماعت کے بانی مرزا غلام احمد کے اس فتوے کی روشنی میں جانچنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ پہلے شخص تھے، جنہوں نے اپنے آپ کو مسلمان اور دیگر تمام مسلمانوں کو "کافر" قرار دیا۔ اور صورت حال آج بھی قادیانیوں کے نزدیک یہی ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے حوالے سے جو گفتگو ناظر قادیان سے ہوئی اس پر روشنی مزید ڈالتے ہوئے

اسسٹنٹ سیکرٹری نے واضح کیا کہ مسلم لیگ میں شمولیت فرقوں کی نمائندگی کی بنیاد کے اصول پر نہیں رکھی گئی ہے۔ لہٰذا قادیانیوں کا یہ دعویٰ کرنا کہ وہ تعداد میں زیادہ بہت منظم و متحد جماعت ہیں اس لیے انہیں مخصوص نمائندگی کا حق دیا جائے بالکل غلط مطالبہ ہے۔ اور مسلم لیگ کو اس میں کوئی کشش نظر نہیں آنی چاہیئے۔ بقول سیکرٹری قادیانیوں کے دعوے بتاتے ہیں کہ وہ "عددی" بیماری (MEGALOMANICE) (بڑائی کا ضبط۔ بڑے کاموں کا ضبط) کا شکار ہیں۔

اس مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ قادیانیوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کو اپنے لیے ایک کارآمد ہتھیار سمجھ کر استعمال کرنے کی ایک سے زیادہ بار کوشش کی لیکن عامۃ المسلمین نے ان کے تمام حربے بے کار کر دیئے۔ دوئم یہ کہ قادیانیوں کو اگر قانونی طور سے پاکستان میں "کافر" قرار دے دیا گیا ہے تو اس پر کوئی اعتراض نہ کرنا چاہیئے کیونکہ ان کے اپنے فتاویٰ کے مطابق قادیانیوں کے علاوہ سب مسلمان کافر ہیں۔ قادیانیوں کے بارے میں تحریک آزادی کے حوالے سے یہ بات بھی عیاں ہے کہ ان کا رویہ آزادی اور مطالبہ پاکستان کی تحریکوں میں اپنے خاص مقاصد کو پورا کرنے کی غرض سے تھا نہ کہ قومی بھلائی کی نیت سے۔

اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل ماخذوں سے مدد لی گئی ہے۔ اشتیاق حسین قریشی۔ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ۔ کراچی ۱۹۶۷ء

انعام الحق کوثر "سید محمد جونپوری اور ذکریت"۔ بحوالہ مجلہ تاریخ و ثقافت پاکستان ۱۹۹۲ء

غلام محمد جعفر "ذکری مذہب کی مختصر تاریخ اور اس کے معتقدات"۔ بحوالہ مجلہ تحقیق پنجاب یونیورسٹی۔ ۱۹۹۳ء۔

مؤتمر المصنفین کا سلسلۂ مطبوعات (۲۱)

تالیف: مولانا عبدالقیوم حقانی

رفیق مؤتمر المصنفین و استاذ دارالعلوم حقانیہ

مؤتمر المصنفین

دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع پشاور پاکستان